منٹو بحیثیت مضمون نگار

ڈاکٹر جمال رضوی

منٹو کی شخصیت تخلیقی سطح پر کئی جہات کی حامل ہے۔ اردو فکشن کی تاریخ میں منٹو کا نام اہم اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اردو کے افسانہ نگاروں کے درمیان منٹو نے اپنے موضوعات اور ان کے انداز پیشکش کی بنیاد پر جو منفرد شناخت قائم کی تھی وہ کل بھی متنازعہ تھی اور آج بھی ہے۔ بو، کھول دو، ٹھنڈا گوشت اور دھواں جیسے افسانوں کی وجہ سے منٹو کو بارہا عدالت کے چکر کاٹنے پڑے، سزائیں بھی ہوئیں۔ اس نے متذکرہ بالا افسانوں کے متعلق اپنے دفاع میں جو بیانات دیے اس پر بھی اعتراضات ہوئے۔ ایسے اعتراضات میں ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ افسانہ نگار کا کام صرف سماج کے نقائص ہی بیان کرنا نہیں ہے اور اگر اسے تہذیب کی عریانی نظر آئے تو صرف اس کو ہی طشت از بام کر دینے سے اس کے فرض کی تکمیل نہیں ہو جاتی بلکہ اس عریانی کا بیان بھی اس انداز میں ہونا چاہیے کہ جسے پڑھنے کے بعد تہذیب کی ستر پوشی کا خیال بھی ذہن میں پیدا ہو۔ اس کے علاوہ ادب، سماج اور زندگی کے متعلق منٹو کا جو مخصوص رویہ تھا وہ بھی ان پر اعتراضات کا ایک سبب تھا۔ منٹو کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرنے والے یا اس پر اعتراض کرنے والوں نے خود کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے جو بھی جواز پیش کیے ان میں اکثر غیر جانب داری کے بجائے ایک قسم کی شدت پسندی نظر آتی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ان سب کے باوصف اس سچائی کو مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ منٹو کے یہاں ادب کا شعور بہت پختہ اور گہرا تھا۔ وہ ادب اور سماج کے باہمی ربط کا ادراک رکھتا تھا اور ان دو عناصر کے ربط باہمی کی توضیح اس نے اپنے مضامین میں کی ہے۔

منٹو نے نثری اصناف کی جن اقسام کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ان کے فنی تقاضوں کو حتی الادسعی ملحوظ رکھا۔ اس نے افسانے کے علاوہ ڈراما، خاکہ، مکتوب اور مضمون کو اپنی جنبش قلم کا محور بنایا۔ منٹو کے مضامین کے تین مجموعے بعنوان 'منٹو کے مضامین'، 'تلخ ترش اور شیریں' اور 'اوپر نیچے اور درمیان' شائع ہوئے۔ ان مجموعوں میں شامل مضامین کی تعداد تقریباً ۷۰ رہے۔ ان مضامین کی نوعیت ادبی، شخصی، سماجی اور سیاسی ہے۔ موضوعات کا تنوع منٹو کی اپنے عہد اور زمانے سے گہری وابستگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے افسانوں کی جو خصوصیت اسے دیگر سے ممتاز بناتی ہے وہی ان مضامین میں بھی نظر آتی ہے۔ انسانی زندگی اور سماج کا مشاہدہ اور ظاہری مناظر کے درون میں پوشیدہ حقائق تک رسائی حاصل کر لینے کی اس کی صلاحیت ان مضامین میں بھی نمایاں ہے۔ ان مضامین میں منٹو نے اپنے ادبی موقف کی بھی وضاحت کی ہے۔

اس طرح یہ مضامین اس کی تخلیقی روش اور ادب ... بھی واقف کراتے ہیں۔ منٹو کے مضامین پر اظہار خیال کرتے ہوئے ... وہاب اشرفی نے لکھا ہے:

”منٹو کے مضامین کو اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے پس منظر میں بھی دیکھنا چاہیے، پھر ان میں اس کے ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے اسے بھی ... نظر رکھنا چاہیے۔ چونکہ یہ مضامین متنوع نوعیت رکھتے ہیں اس لیے ان میں بھی منٹو مکمل نظر آتا ہے۔“

(بحوالہ 'منٹو کے مضامین' ڈاکٹر غضنفر اقبال، مشمولہ 'ایوان اردو' فروری ۲۰۱۳ء، صفحہ ۳۹)

اس اقتباس کے آخری جملے سے 'بھی' کو حذف کر دیا جائے تو منٹو کے مضامین کی اہمیت اور معنویت مزید واضح ہو جائے گی۔ افسانے میں اپنے مخصوص افکار و خیالات کو پیش کرتے وقت فنی مطالبات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے اور اس مرحلے پر بارہا افسانہ نگار کو اپنے خیالات کی پیشکش میں قطع برید سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس مضمون میں عموماً اس طرح کی پابندی نہیں ہوتی۔ یہاں جس نکتے کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھنا ہوتا ہے وہ یہ کہ مضمون نگار جس موضوع کو منتخب کرے اس سے متعلق معلومات اس ترتیب اور سلیقے سے بیان کرنے کہ اس کے مافی الضمیر کی ترسیل اس انداز میں ہو کہ تفہیم کا کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو۔ اس کے علاوہ اپنے معروضات کو مدلل انداز میں پیش کرنا بھی مضمون کو وقیع اور اہم بناتا ہے۔ ان معیار پر منٹو کے بیشتر مضامین پورے اترتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کو روایتی تعلیم کے سفر کو اعلیٰ مدارج تک پہنچانے میں کامیابی بھلے ہی نہ ملی ہو لیکن دنیا اور معاملات دنیا سے متعلق معلومات اس کے ذوق علمی اور بیدار ذہنی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

چونکہ منٹو نے باضابطہ طور پر ادب کو ایک پیشے کے طور پر اختیار کیا تھا اس لیے وہ اپنی تخلیقات کو بہتر سے بہتر بنانے کی شعوری کوشش کرتا تھا۔ لیکن یہاں اس بات کا بھی ذکر ضروری ہے کہ اس کوشش میں وہ تخلیقات شامل نہیں ہیں جو منٹو کی مالی ضروریات کی تکمیل کی خاطر ہنگامی طور پر وجود میں آئیں۔ محققین نے نشاندہی کی ہے کہ منٹو کے افسانوی سرمایہ میں تقریباً ۵۰ رکہانیاں ایسی ہیں جو منٹو نے بڑی عجلت میں لکھی تھیں۔ یہ کیفیت ان کے بعض مضامین کی بھی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مضامین بھی ایسے ہی مخصوص حالات میں لکھے گئے ہوں گے۔

منٹو کے مضامین کے سرمایہ میں جو تحریریں شامل ہیں وہ اس کی شخصیت کو اس کی تمام جزئیات کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ ان مضامین میں منٹو کی ذات کے حوالے سے اس عہد کا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے جو کہ برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم موڑ سے عبارت ہے۔ اس دور میں زندگی کرنے کے طور طریقوں سے لے کر ادب سے وابستہ تصورات و نظریات میں تغیر پذیری کا عمل واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً بات اگر ادب کے ضمن میں کریں تو اسے بہرحال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ افادی و فطری ادب کی تخلیق کے رجحان کو

بڑھاوا ملنے کے ساتھ ہی صاحبانِ قلم کے افکار کو جس طرح ایک مخصوص نظریہ کے دائرے میں محصور کر دیا گیا تھا اس کی وجہ سے نثری و شعری اصناف میں مختلف تخلیق کاروں کے یہاں ایک حد تک یکسانیت اور میکانیکی رویہ نظر آتا ہے۔ روسی مصنفین سے حد درجہ مرعوب اور سماج میں اشتراکی نظام کی پیروی کرنے والے منٹو کے یہاں یہ میکانیکی رویہ عموماً نظر نہیں آتا۔ اس نے اپنے ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے مختلف مضامین میں بہت معنی خیز اور کارآمد باتیں کہی ہیں۔ ان تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منٹو نے اگرچہ افسانے کسی نہ کسی خاص موضوع پر لکھے لیکن اس موضوع کے فنی اظہار میں ان تمام تخلیقی امکانات پر اس کی نظر ہوتی تھی جو اس کے افسانے میں زندگی کی حرارت اور کشمکش حیات کی موثر عکاسی کرتی ہے۔ اپنے ایک مضمون 'ہندوستان کی صنعت فلم سازی پر ایک نظر' میں اس نے افسانے کی تخلیق کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ افسانے کی تخلیق میں چند بندھے ٹکے خطوط پر چلنا مستحسن نہیں سمجھتا تھا:

''افسانے کی بساط، شطرنج کی بساط نہیں جس پر صرف مقررہ مہرے چلتے ہیں۔ افسانے کی بساط اس وسیع دنیا کی بساط ہے جس پر ان گنت مہرے چل رہے ہیں۔ افسانے، ہیرو، سائڈ ہیرو، ہیروئن، سائڈ ہیروئن، ولن، سائڈ ولن، وہیمپ اور سائڈ وہیمپ کے بغیر بھی افسانے ہو سکتے ہیں۔ پر ذرا سمجھ کی ضرورت ہے۔'' (بحوالہ 'منٹو کے مضامین' صفحہ ۱۴۴)

اس اقتباس سے انسانی سماج سے اس کی وابستگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس مضمون کا اقتباس ابھی پیش کیا گیا اس کا مرکزی موضوع گرچہ ہندوستانی فلمی صنعت ہے لیکن اس حوالے سے زندگی، سماج اور ادب بھی زیر بحث آگیے ہیں۔ اس مضمون میں منٹو نے ہندوستانی سماج کے متعلق جو دوٹوک اظہار خیال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فلم صرف تفنن طبع کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ معاشرہ کے روشن و تاریک ہر دو رخ کی عکاسی اس طرح کی جانی چاہیے جس میں سبق آمیزی بھی ہو۔ منٹو چونکہ مقصدی ادب کا قائل تھا جس کا واضح اس نے اپنے ایک مضمون 'کسوٹی' میں کیا ہے، اسی طرح وہ مقصدی سنیما کا بھی قائل تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا:

''ہمیں اس وقت ایسے فلم درکار ہیں جو ہمیں کچھ سکھائیں، ایسے فلم نہیں چاہئیں جو ہمیں سب کچھ بھلا دیں۔ جو ہمارے اذہان کو زنگ آلود کر دیں۔ ہمیں اپنی زبان سے پیار کرنا سکھایا جائے، ہمیں اپنے وطن سے پیار کرنے کا سبق دیا جائے، ہمیں محبت کے حقیقی معنوں سے آشنا کرایا جائے۔ ہمارے سامنے کتاب انسانیت کے اوراق کھولے جائیں۔''

منٹو کے یہ مطالبات سن کر بعض نام نہاد جدید افکار کے حامل اشخاص اسے رجعت پسند اور دقیانوس بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ اب ایک حلقہ بڑے زور و شور سے یہ مشتہر کرنے میں منہمک ہے کہ فلم اور ٹی وی کا مقصد سماج کی اصلاح نہیں صرف تفریح فراہم کرنا ہے۔ فلم کو صرف تفریح کا ذریعہ ماننے والوں کا یہ کہنا ہے کہ آج کی مصروف ترین اور پیچیدگی سے بھری زندگی سے اکتا کر جب کوئی شخص اپنے ذوق بصارت کی تسکین کے لیے ان ذرائع کا استعمال کرتا ہے تو اسے سماجیات و اخلاقیات کا درس دے کر اس کے ذہن کو مزید بوجھل بنانا درست نہیں۔ یہ طرز فکر بعض مصلحتوں اور ذاتی مفاد کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جزوی سچائی کو کلیہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جدید انسانی معاشرہ کی سمت و رفتار بہت حد تک ان ذرائع پر منحصر ہے۔ ماہر سماجیات کے علاوہ بعض ادیبوں نے بھی اس پر اصرار کیا ہے کہ انسانی معاشرہ پر فلم کے اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے بھی باقاعدہ طور پر ادب میں شمار کیا جائے۔ اس کی وکالت کرتے ہوئے ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے بھی ایک طویل مضمون اب سے کچھ برسوں قبل لکھا تھا کہ فلم انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے مختلف مظاہر کو بہ یک وقت پیش کرتی ہے اور ان مظاہر کا تعلق کسی نہ کسی طور پر انسانی تہذیب و معاشرت سے ہوتا ہے اس لیے فلموں کو باقاعدہ ادب کے زمرے میں شامل کیا جانا چاہیے۔ انسانی معاشرہ پر فلم کی اثر پذیری نے فی زمانہ جو معاشرتی مسائل پیدا کیے ہیں اس کا ایک سبب عالمی سطح پر تہذیب اور انسانی اقدار کا بحران ہے۔ خصوصاً ملکی تناظر میں اگر اس حوالے سے بات کریں تو خواتین کے تحفظ کے سلسلے میں گزشتہ ۳، ۴ ماہ سے جو تگ و دو ہو رہی ہے اس میں یہ موضوع بھی زیر بحث رہا ہے کہ ہندوستانی فلموں سے ہندوستانی کلچر پوری طرح غائب ہو چکا ہے۔ دنیا کی چند بڑی طاقتیں جس مخصوص کلچر کو عالمی انسانی معاشرہ پر مسلط کرنا چاہتی ہیں اس کے لیے اس ذریعہ کا بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ منٹو نے مذکورہ مضمون میں اس کی جانب بہت واضح اشارہ کیا تھا کہ غیر ملکی کلچر کو فلموں میں پروسنے کے بعد ہندوستانی معاشرہ کن مسائل سے دوچار ہوگا۔ اس نے لکھا تھا:

''ہندوستان میں ٹھیٹ ہندوستانی فلم بننے چاہئیں۔ ہمارے وہ سوشل فلم جو آج کل سیکڑوں کی تعداد میں سینماؤں کے پردوں پر چلتے ہیں کیا ہندوستانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں؟ اس کا جواب موٹے قلم سے یہ ہونا چاہیے نہیں! آپ ان فلموں میں کبھی ہندوستانیت کو امریکی لباس میں دیکھتے ہیں اور کبھی امریکہ دھوتی کرتے میں نظر آتا ہے۔ جو بیحد مضحکہ خیز ہے۔'' (صفحہ ۱۲۰)

فلمی دنیا میں گزرے منٹو کے شب و روز ہر چند کہ اس کے لیے بہت اطمینان بخش نہ رہے ہوں لیکن اس وابستگی نے اس کی تخلیقیت کو کئی جہات عطا کیے۔ اس کے نتیجے میں جو افسانے اور خاکے منٹو نے لکھے وہ اس دنیا کے ان حقائق کو بیان کرتے ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ منٹو نے اپنے مضامین میں ہر اس انسانی رویہ کو مدف بنایا جس میں اسے مضحکہ خیزی نظر آئی۔ منٹو کے نزدیک اس مضحکہ خیزی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ سماج اور متعلقات سماج کے تجزیہ کے دوران تمام جزئیات کو مدنظر نہ رکھ کر کسی ایک جہت یا پہلو پر جب توجہ مرکوز کی جاتی ہے تب اس طرح کی مضحکہ خیزیاں وجود میں آتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ معاشرہ کو اس مخصوص زاویہ سے دیکھنے کے نتیجے میں فکر و خیال میں ایک قسم کی شدت پسندی پیدا ہو جاتی ہے جو اپنے ارتقائی مدارج پر پہنچ کر بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ منٹو نے صرف سماج یا زندگی میں ہی نہیں بلکہ ادب میں بھی ایسی شدت پسندی کی مخالفت کی اور اسی وجہ سے اس نے نام نہاد تحریکوں سے بھی خود کو دور رکھا۔ گرچہ وہ انسانی سماج میں مساوات کی کھلے بندوں حمایت کرتا تھا لیکن اس کے زمانے میں بعض ترقی پسندوں نے ذریعہ اس حوالے سے جو ادب تخلیق کیا جا رہا تھا اس پر منٹو نے اپنے اکثر مضامین میں طنز کیے ہیں۔ منٹو نے اپنے

ایک مزاحیہ مضمون 'دیواروں پر لکھنا' میں اس نام نہاد ترقی پسندی کو ہدف بناتے ہوئے لکھا ہے:

''مسجد میں چلے جایئے اس کے غسل خانے کی دیواروں پر بھی آپ کو ترقی پسند ادب اور ترقی پسند مصوری بکھری نظر آئے گی۔'' اس ایک جملے میں منٹو نے تحریک کے تخلیقی رویہ کو جس طرح ہدف بنایا ہے، بہت ممکن ہے کہ اس میں ان ترقی پسندوں کے لیے انتقامی جذبہ بھی شامل رہا ہو جنہوں نے منٹو کے افسانوں کو گندی نالی کے کیڑوں سے مشابہ قرار دیا تھا۔ لیکن بہر حال یہ بھی حقیقت ہے کہ ترقی پسندی کے نام پر چند تحریریں ایسی بھی منظر عام پر آئیں جو مسجد کے غسل خانے کی دیواروں پر لکھی جانے والی مخصوص قسم کی تحریروں کے مماثل تھیں۔ اس ایک جملے میں منٹو نے انسانی نفسیات کے اس دلچسپ رویہ کی طرف بھی بلیغ اشارہ کیا ہے، جو مذہب و معاشرت کے تقاضوں اور پابندیوں کے سبب اپنے اظہار کے لیے ایسے مواقع تلاش کرتا رہتا ہے۔ جس طرح منٹو کی دیگر تخلیقات میں سماجی سروکار کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ویسے ہی اس کے مضامین بھی انسانی سماج کی نیرنگیوں اور گونا گونی کو مختلف حوالوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہر بڑے فنکار کی طرح منٹو بھی انسانی معاشرہ کے متعلق مخصوص نظریات رکھتا تھا۔ یہ نظریات کس حد تک حقیقت پسندی پر مبنی تھے، یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن یہ تو بہر حال ماننا پڑے گا کہ منٹو نے سماج کا مشاہدہ بہت باریک بینی سے کیا تھا۔ اس عمل سے گزرنے میں منٹو کی فنی بصیرت کے علاوہ اس کے ذاتی حالات نے بھی حقائق کی گرہ کشائی میں اس کی معاونت کی۔

سماج کے مطالعے میں منٹو نے مذہب، سیاست اور معیشت کو اہم اور ایسے عناصر کے طور پر دیکھا جن کی اثر پذیری کا دائرہ انسانی معاشرہ پر بہت وسیع ہوتا ہے۔ ان عناصر سے صالح اقدار کے معدوم ہونے کے بعد ایک مہیب تاریکی معاشرہ کو اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہے اور انسانی فطرت اور نفسیات پر اس کے اثرات اس طرح ظاہر ہوتے ہیں جو تہذیب و تمدن کے دھارے کو ایسے رخ پر موڑ دیتے ہیں جو امن و آشتی کے لیے ایک بڑا خطرہ بن جاتا ہے۔ چونکہ منٹو نے سیاست اور مذہب کے غلط استعمال کے نتائج خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اس لیے اپنے افسانوں میں اس انسانی رویہ پر تیکھے طنز کیے اور اس موضوع پر جو مضامین لکھے اس میں اس کی جرأت مندی اس کی انسان دوستی کا بین ثبوت ہے۔ اپنے مضامین میں منٹو نے سیاست دانوں پر جو بے لاگ تبصرے کیے وہ اس کے جرأت اظہار کی نمایاں مثال ہے۔ مضمون 'ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ' میں سیاست دانوں کو ہدف بناتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:

''یہ لوگ جو اپنے گھروں کا نظام درست نہیں کر سکتے، یہ لوگ جن کا کیریکٹر بے حد پست ہوتا ہے، سیاست کے میدان میں اپنے وطن کا نظام ٹھیک کرنے اور لوگوں کو اخلاقیات کا سبق دینے کے لیے نکلتے ہیں۔ کس قدر مضحکہ خیز چیز ہے۔'' (صفحہ ۸۷)

ابھی یہ عرض کیا گیا کہ منٹو نے اپنے مضامین میں ہر انسانی رویہ کو ہدف بنایا جس میں اسے مضحکہ خیزی نظر آئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ برصغیر کے سیاسی منظر نامہ پر اکثر ایسے مضحکہ خیز معاملات رونما ہوتے رہے ہیں جن سے نام نہاد لیڈروں کی اہلیت اور دانشوری کی مضحکہ خیزی کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ سیاست دانوں کے ذریعہ خدمت خلق کے نام پر سرمایہ جمع کرنے کی ہوس پر بھی منٹو نے تیکھے طنز کیے ہیں۔ مذکورہ مضمون میں اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضا بگاڑ رہے ہیں اور عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے مگر یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے یہ نام نہاد لیڈر اپنی اپنی بغل میں ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں۔ جن میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک لمبی دوڑ ہے سرمائے کے پیچھے۔ ان کے ہر سانس میں آپ ریاکاری اور دغابازی کا تعفن محسوس کر سکتے ہیں۔'' (صفحہ ۸۸)

جدید زمانے کی سیاست میں سیاست دانوں کا یہ رویہ گرچہ ایک عالم گیر مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسے خصوصی طور پر اگر ملکی تناظر میں دیکھیں تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ منٹو نے سیاست اور سماج کے متعلق جو کچھ بھی کہا تھا وہ آج کے عہد کی ایک بڑی سچائی ہے۔ انسان کی سماجی زندگی کو متاثر کرنے والے سیاست اور مذہب جیسے عناصر کے عواقب و عوامل کو منٹو نے اپنے مضامین میں جس طرح بیان کیا ہے وہ اس کے سیاسی و سماجی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ انسانی تاریخ کے مختلف مراحل اور مدارج سے کما حقہ واقف تھا۔ اس لیے وہ اپنے مضامین میں اکثر ایسے جملے لکھ جاتا ہے جو اپنے دامن میں پورا ایک عہد اور تاریخ سمیٹے ہوتے ہیں۔ منٹو نے 'اگر' کے موضوع پر جو مضمون لکھا ہے وہ اس دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے۔ اس مضمون میں منٹو نے اس کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ 'اگر' بعض اوقات ان حقائق کی نوعیت بھی تبدیل کر دیتا ہے جنہیں مسلمات کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس 'اگر' کے ذریعہ ہی فلسفہ اور سائنس جیسے علوم میں نئی راہیں وا ہوتی ہیں۔

منٹو نے اپنے مضامین میں عورتوں کی زندگی اور ان کے مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ایسے مضامین میں بیشتر عورتوں کے اسی طبقہ کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے جسے مہذب سماج کے دامن پر ایک بدنما دھبہ تصور کیا جاتا ہے۔ منٹو نے ان مضامین میں جسم کا سودا کرنے والی عورتوں کے مسائل کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ اس طبقہ سے منٹو کی سچی ہمدردی کو نمایاں کرتا ہے۔ منٹو نے جسم فروشی کرنے والی عورتوں کے اس عمل کو جائز ٹھہرانے کے لیے جو معروضات پیش کیے وہ گرچہ مکمل طور پر قابل قبول نہ ہوں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس مسئلے کا جائزہ لیتے وقت اس نے عورتوں کو اس راہ پر چلنے کے لیے آمادہ کرنے والے ان اسباب پر بھی غیر جانب دارانہ طور پر روشنی ڈالی ہے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ موضوع منٹو کے افسانوں میں بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ منٹو نے اس موضوع پر لکھے افسانوں میں سوگندھی، سلطانہ، زینت، جانکی اور گھاٹن جیسے کرداروں کو جس طرح پیش کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی جنسی تسکین کا سامان فراہم کرنے والی یہ عورتیں دراصل خلوص، ایثار اور ہمدردی کے جذبہ سے اس قدر سرشار ہوتی ہیں جو انہیں محبت و ممتا کے اعلیٰ مدارج پر پہنچا دیتا ہے۔ عورتوں کے اس طبقے کے تئیں سماج کے دوہرے رویہ پر طنز کرتے ہوئے منٹو نے اس کے لیے مردوں کو بھی برابر کا

ذمہ دار قرار دیا ہے۔ منٹو نے مضمون 'عصمت فروشی' میں اس طبقہ کے مسائل اور ان کے اسباب کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عصمت فروش عورت ایک زمانے سے دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھی جاتی رہی ہے۔ مگر کیا ہم نے غور کیا ہے کہ ہم میں سے اکثر ایسی ذلیل خوار ہستیوں کے در پر ٹھوکریں کھاتے ہیں؟ کیا ہمارے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم بھی ذلیل ہیں۔'' (صفحہ ۱۶۲/)

اس موضوع پر منٹو نے جو افسانے لکھے اور جن کی بنا پر منٹو کو فحش نگار قرار دے کر مہذب سماج کی اخلاقیات کو بگاڑنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا، اگر ان افسانوں کی تفہیم میں منٹو کے صرف اسی ایک مضمون 'عصمت فروشی' پر نظر ڈال لی جاتی تو شاید یہ نہ کہا جاتا کہ منٹو معاشرہ میں جنسیات کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ کیا اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ معاشرہ میں عورتوں کے اس طبقہ کے وجود میں آنے کا ایک بڑا سبب مردوں کی وہ نفسانی خواہشیں ہیں جن کی تکمیل کے لیے مرد اکثر ایسی عورتوں کے در پہ دستک دیتا ہے۔ انسانی بستی میں چکلوں کے وجود کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:

''ویشیا پیدا نہیں ہوتی، بنائی جاتی ہے یا خود بنتی ہے۔ جس چیز کی مانگ ہوگی منڈی میں ضرور آئے گی۔ مرد کی نفسانی خواہشات کی مانگ عورت ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ چنانچہ اس مانگ کا اثر یہ ہے کہ ہر شہر میں کوئی نہ کوئی چکلہ موجود ہے۔ اگر آج یہ مانگ دور ہو جائے تو یہ چکلے خود بخود غایب ہو جائیں گے۔''

مرد اساس (Male Dominant) سوسائٹی میں اس طرح کی بیباکی منٹو کی جرات اظہار کو نمایاں کرنے کے ساتھ ہی اس کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ منٹو نے کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے وقت اپنے افکار پر نہ تو مصلحت پسندی کی ملمع کاری کی اور نہ ہی کسی طرح کے تحفظات کو ترجیح دی۔ منٹو نے جن موضوعات پر مضامین لکھے ان کے متعلقات اور اسباب پر معروضی انداز میں روشنی ڈالی۔ مذہب، سیاست، معیشت، زبان و ادب اور انسانی تہذیب و تمدن سے وابستہ معاملات و مسائل پر لکھے گیے ان مضامین کے ذریعہ منٹو کی دانشوری اور گرد و پیش کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے کی صلاحیت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ مضامین منٹو کے سماجی و سیاسی شعور کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان تحریروں کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے جو منٹو نے 'چچا سام کے نام خط' کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کی تھیں۔ ان تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کو عالمی سیاست کا بھی خاصہ درک تھا۔

منٹو کے مضامین کو اسلوب کی بنیاد پر دو اقسام میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم ایسے مضامین کی ہے جنہیں سنجیدہ مضامین کہا جاسکتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اسلوب ظریفانہ ہے۔ ایسے مضامین میں طنز و مزاح کا خوبصورت فنی امتزاج نظر آتا ہے جسے پڑھ کر لبوں پر تبسم ہی رقصاں نہیں ہوتا بلکہ ایسے مضامین غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ یوں بھی سنجیدہ نثر کے مقابلے ظریفانہ اسلوب زیادہ متاثر کن ہوتا ہے۔ اس قسم کے مضامین میں منٹو نے الفاظ کے در و بست اور جملوں کی ساخت میں وہ التزام برتا ہے جس سے حظ پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ذہن غور و فکر پر بھی آمادہ ہوتا ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں کے ذریعہ جس طرح سماج کی سفاک حقیقتوں کو بیان کیا ہے ویسے ہی مضامین کے ذریعہ ان نکات پر روشنی ڈالی ہے جو انسانی زندگی کو انفرادی یا اجتماعی سطح پر متاثر کرتے ہیں۔ منٹو کے مضامین پر اظہار خیال کرتے ہوئے وارث علوی نے لکھا ہے:

''منٹو کے مضامین پڑھتے ہوئے ہمارے سامنے ایک ایسے آبلہ پا آدمی کی تصویر ابھر آتی ہے جو آگ کی لپٹوں میں گھری دنیا میں چاروں سمت دوڑ رہا ہے، کہیں جائے اماں نہیں، کہیں سکون نہیں۔'' (منٹو اور مزاح صفحہ ۹/)

معاشرتی ناہمواریوں اور انسانوں کی سفاکی نے منٹو کے افکار میں جو کرب آمیز کیفیت پیدا کر دی تھی اس کا اظہار منٹو نے اپنے مضامین میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کیا ہے اور یہ تحریریں بلاشبہ اس کی انسان دوستی کا واضح ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر جمال رضوی

شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی
لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ

- - - - - - - - - - - - - -